"تذکرۂ جمیل" اور اصول تذکرہ نگاری

از قلم: ساجد علی مصباحی، جامعہ اشرفیہ، مبارک پور، اعظم گڑھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

تذکرہ عربی زبان کا لفظ ہے، اس کے لغوی معنیٰ ہیں: ذکر، چرچا، یادداشت، یادگار، سرگزشت، سوانح عمری اور وہ کتاب جس میں شعرا کا حال لکھا جاتا ہے۔ اور "**جمیل**" بھی عربی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معنیٰ ہیں: حسین، خوب صورت۔ یوں "تذکرۂ جمیل" کے معنیٰ ہوئے "حسین یادگار، خوب صورت سوانح حیات یا وہ کتاب جس میں خوش اسلوبی کے ساتھ شعرا کے احوال درج ہوں"۔

تذکرہ کے اصطلاحی معانی ومفاہیم:

ارباب علم ودانش کی اصطلاح میں "تذکرہ" کا استعمال پہلے ایسی کتاب پر ہوتا تھا جس میں شعرا کے حالات بڑے اختصار کے ساتھ بیان ہوتے تھے اور ان کے مختلف کلام بطور نمونہ درج کیے جاتے تھے، پھر اس کا استعمال اس کتاب پر بھی ہونے لگا جس میں اولیاے کرام، علماے دین اور دیگر مشاہیر علوم وفنون کے احوال وکوائف درج ہوتے تھے۔ چنانچہ ڈاکٹر فرمان، فتح پوری لکھتے ہیں:

"اگر تذکروں کی عام روش کو نظر میں رکھ کر "تذکرہ نگاری" کے مفہوم یا اس کی تعریف کا تعین کرنا چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ "بیاض" کی ترقی یافتہ صورت کا نام "تذکرہ" ہے۔ بیاض میں صرف اشعار کا انتخاب ہوتا تھا، جب اس میں انتخاب اشعار کے ساتھ صاحبان اشعار کے نام اور تخلص کا اضافہ کر دیا گیا تو اس کا نام "تذکرہ" ہو گیا۔ بعد ازاں شعرا کے نام اور تخلص میں خاص ترتیب پیدا کی گئی، کہیں ابجدی ترتیب ملحوظ رکھی گئی، کہیں تہجی ترتیب کو ترجیح دی گئی، اس کے ساتھ مختصر حالات زندگی اور کلام پر مختصر تبصرے کا اضافہ ہوا اور "تذکرہ" بیاض سے آگے بڑھ کر نیم تاریخی، نیم تنقیدی اور نیم سوانحی فضا میں داخل ہو گیا۔ وقت اور ماحول کے تقاضوں کے تحت تذکروں پر ادبی تاریخ، تنقید اور سوانح نگاری کا رنگ گہرا ہوتا گیا اور رفتہ رفتہ تین رنگوں کا یہی آمیزہ جسے حقیقی معنوں میں نہ ادبی تاریخ کا نام دے سکتے ہیں، نہ تنقید کہہ سکتے ہیں اور نہ سوانح نگاری سے تعبیر کر سکتے ہیں، تذکرے کا فن قرار پایا اور شعرا کے مختصر حالات، کلام پر سرسری تبصرہ اور انتخاب اشعار کو اس فن کے عناصر ترکیبی میں شمار کیا گیا"۔ [اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری، ص:۱۱، مجلس ترقی ادب، لاہور، پاکستان]

چند سطور کے بعد مزید لکھتے ہیں:

"لغت کی رو سے اصطلاح شعر وادب میں اشعار اور احوال شعرا سے متعلق کتاب کو "تذکرہ" کہتے ہیں، لیکن جب شعر وادب کے سیاق وسباق سے ہٹ کر اسے استعمال کیا جائے گا تو اس سے مراد صرف شعرا کا تذکرہ نہیں، بلکہ علما، فضلا، صوفیا، اطبا، اولیا اور حکما کا تذکرہ بھی ہو سکتا ہے۔ اردو اور فارسی میں ان معنوں میں لفظ "تذکرہ" کے استعمال کی مثالیں ایک دو نہیں سیکڑوں ہیں، اور آج سے نہیں، مدت سے ہیں"۔ [ایضا، ص:۱۲]

اس سلسلے میں ڈاکٹر عبد المنان یوں رقم طراز ہیں:

" تذکرہ ایک ایسی صنف ادب کا نام ہے جو شعرا کے حالات زندگی اور ان کی خدمات پر مبنی ہو . . .
ابتدا میں تذکرہ کی شکل واضح طور پر نمایاں نہیں ہوئی تھی، لیکن اب اسے ایک باقاعدہ صنف ادب کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے اور دیگر اصناف کی طرح اس کے بھی چند اصول وضابطے مرتب ہوگئے ہیں جن سے عہدہ برآ ہوکر ایک تذکرہ نگار کامیاب تذکرہ نگاری کا ثبوت پیش کرتا ہے . . . تذکرہ نہ صرف کسی شاعر کی زندگی کے شب وروز کے احوال پیش کرتا ہے، بلکہ وہ تاریخ، سوانح حیات اور خاکے کے لیے اہم مواد بھی فراہم کردیتا ہے؛ اس لیے تذکرہ کی تہوں میں نظام معاشرت، تہذیبی لہریں اور مختلف اشخاص کے غور وفکر کے طریقے کی بھی جھلکیاں ملتی ہیں . . . ہر چند کہ لغات میں تذکرہ کا مفہوم شعرائے اردو تک محدود ہے، لیکن دامن تذکرہ میں اس کے امکانات وسیع ہیں، یہ محض شعرائے اردو یا نثر نگار تک محدود نہیں، بلکہ اولیائے کرام وبزرگان دین اور دیگر مشاہیر علوم وفنون بھی تذکروں میں شامل ہوسکتے ہیں۔ اردو میں علمائے کرام اور صوفیائے کرام کے حالات پر مبنی تذکرے لکھے گئے"۔

[بنگال میں اردو تذکرہ نگاری، ص:۱۴، ۱۵، ۱۶، ملخصا، مغربی بنگال اردو اکیڈمی]

فن تذکرہ نگاری اور اس کا دائرۂ کار :

تذکرہ نگاری ایک اعلیٰ وارفع فن ہے جس کا نثری اصناف میں اپنا ایک نمایاں مقام ہے، بطور خاص اردو زبان وادب کا مورخ تو تذکروں سے استفادہ کیے بغیر ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتا۔ بلاشبہہ انھیں شعرائے اردو کے تذکروں کی بدولت ہمارے ادب میں سوانحی، تاریخی، تحقیقی اور تنقیدی شعور پیدا ہوا۔

ایک تذکرہ نگار سوانحی حالات کے تحت شعرا کے نام اور تخلص، وطن اور جائے پیدائش وقیام، علمی وفنی استعداد، شاگردی واستاذی کے سلسلے اور روابط، تصنیفی وتالیفی کارناموں کی نوعیت اور کلام کے معیار ومذاق کے متعلق ابتدائی قسم کی ضروری معلومات فراہم کرتا ہے اور نمونۂ کلام کے ذیل میں عام طور پر متفرق غزلوں یا متفرق اصناف سخن کے منتخب اشعار یا بند پیش کرتا ہے۔ پروفیسر حنیف احمد نقوی شعرائے اردو کے تذکروں کی فنی، تاریخی، سوانحی، تنقیدی اور ادبی اہمیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

" تذکرہ نویسی کا فن نہ تو براہ راست تاریخ نگاری کے ذیل میں آتا ہے، نہ اسے فن سیرت یا سوانح نگاری کے تحت رکھا جاسکتا ہے اور نہ اس کا دائرہ کار تنقید کی طرح صرف اچھے برے کی پرکھ تک محدود ہے، بلکہ در حقیقت یہ ان تمام فنون یا اصناف ادب کا آمیزہ اور بجائے خود ایک فن یا صنف ادب ہے۔

تذکرہ نگار شاعر کے مختصر حالات زندگی قلم بند کرتا ہے، اس کی شخصیت کی تعمیر میں کارفرما عوامل کا ذکر کرتا ہے، اس کی وضع قطع اور عادات واخلاق کی کیفیت بیان کرتا ہے اور اس کے کلام کی خوبیوں اور خامیوں پر اجمالی انداز میں تبصرہ کرتے ہوئے آخر میں بطور نمونہ چند اشعار پیش کرکے اپنی ذمے داریوں سے سبک دوش ہوجاتا ہے۔

اگر تحقیق وجستجو کے دوران کسی محقق کو تذکروں کی تشنگی اور تنگ دامانی کا احساس ہوتا ہے تو یہ ایسا نقص نہیں جس کی بنا پر پوری صنف کو دفتر بے معنیٰ قرار دے دیا جائے۔ اردو کی توسیع وترقی کے لیے کی گئی کوششوں کی روداد جب بھی قلم بند کی جائے گی، تذکروں سے دامن بچاکر گزر جانا ممکن نہ ہوگا"۔

[شعرائے اردو کے تذکرے، نکات الشعرا سے گلشن بے خار تک، ص:۸۷۹]

تذکرہ نگاری کے میدان میں در پیش مشکلات کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر رئیس احمد لکھتے ہیں:

" تذکرہ نگار کو بیاض نویس کی مجمل بیانی اور مورخ کی مفصل نگاری کے درمیان اعتدال و توازن کی نہایت مشکل ترین راہ اختیار کرنی پڑتی ہے اوراس مرحلے میں وہ دقت نظر اور قوت فیصلہ کی پے بہ پے آزمائشوں سے دوچار ہوتا ہے ،چوں کہ ایک طرف تذکرہ نگار کے لیے متذکرہ شعرا کی زندگی کے ان جملہ پہلوؤں کی عکاسی ناگزیر ہوتی ہے جن کا مطالعہ کیے بغیر متعلقہ/متذکرہ شاعر کی شخصیت کا ادراک ناممکن ہو،اور دوسری جانب ایسے جملہ واقعات کو نظر انداز کرنا ضروری ہوتا ہے جنھوں نے متعلقہ شاعر کی شخصیت اور فن کی تعمیر میں کوئی خاص/اہم کردار ادا نہیں کیا ہے"۔

[اردو تذکرہ نگاری ۱۸۳۵ کے بعد، ص:۴۲، ۴۳۔ عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی ۹۵۔]

تاریخ و تذکرہ میں فرق:

تاریخ و تذکرہ میں فرق یہ ہے کہ تاریخ میں بحث واقعات زمانہ سے ہوتی ہے خواہ اس کا تعلق کسی بھی امر سے ہواور تذکرے میں اشخاص کا بیان مقصود ہوتا ہے اور تاریخ کا ذکر تبعًا کیا جاتا ہے؛اس لیے یہ کہا جاسکتا ہے کہ تاریخ عام ہے اور تذکرہ خاص ہے۔ڈاکٹر فرمان ،فتح پوری "مقدمۂ طبقات الشعرا" کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"واضح ہو کہ تاریخ اس کو کہتے ہیں جس میں واقعات یا حالات زمانہ اس طور پر لکھے جائیں کہ اس سے یہ معلوم ہو سکے کہ فلاں زمانے میں یہ حادثہ یا واقعہ گزرا ، بخلاف تذکرہ کے ، کہ اس میں ایک خاص قسم کے لوگوں کا حال لکھا جاتا ہے، مثلاً تذکرۃ الشعرا، یا تذکرۂ انبیا، یا تذکرۂ اولیا وغیرہ۔اس سے معلوم ہوا کہ تذکرہ خاص ہے اور تاریخ عام، کہ وہ تذکروں کو بھی مشتمل ہے۔

اور یہ بھی معلوم ہوا کہ تذکرہ ایک قسم کی تاریخ ہے بشرطے کہ اس میں ہر ایک شخص کے زمانہ کا بھی حوالہ ہو اور اگر صرف حال ہو اور تاریخ کسی کی دریافت نہ ہو سکتی ہو اور نہ مصنف کے بیان سے واضح ہو کہ کس زمانے کا یہ حال بیان کرتا ہے تو اس صورت میں (تذکرہ) داخل تاریخ نہ ہوگا، بلکہ ایک قسم علی حدہ مقابل تاریخ کے ہوگی۔اس صورت میں نسبت تضاد کی ہوگی"۔

[اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری، ص:۱۳، مجلس ترقی ادب، لاہور، پاکستان]

تذکرہ نگاری کے فوائد:

تذکرہ نگاری کے فوائد بہت ہیں ، تذکرہ شعرا کے حالات زندگی ، ان کی سیرت و شخصیت اور تخلیقی کاوشوں کے متعلق حصول معلومات کا اہم ترین ذریعہ ہے۔یہ اہم شخصیتوں کے کارناموں کو یادگار زمانہ بنادیتا ہے اور لوگوں کو فن کاروں کی حیات اوران کی کارگزاریوں سے آشنا کرتا ہے۔نیز مختلف العہد تذکروں کے تقابلی مطالعہ سے زمانے کے ساتھ بدلتے ہوئے ادبی رجحانات ، فن کی منزل بہ منزل ترقی اور زبان کے عہد بہ عہد ارتقا کی رفتار اور کیفیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

اس تعلق سے ڈاکٹر رئیس احمد لکھتے ہیں:

● شعرائے اردو کے تذکروں نے ایسے بے شمار فن کاروں کو بے نام و نشان ہونے سے بچالیا ہے جن کے کارنامے یا تو کسی وجہ سے مدون نہ ہو سکے ، یا پھر مدون ہونے کے بعد ضائع ہو گئے۔فن کاروں کے اس

زمرے میں ایسے اساتذہ بھی شامل ہیں جنھوں نے انتہائی نازک مراحل میں کاروان شعروسخن کی قیادت کی ہے اور اپنی کوششوں سے ایک نئے عہد کو جنم دیا ہے، مثال کے طور پر مصطفیٰ خان یک رنگ، خان آرزو اور مظہر جان جاناں جیسے اساتذۂ فن کی تخلیقات کا جس قدر سرمایہ آج موجود ہے وہ تذکروں ہی کے واسطے سے حاصل ہوا ہے۔

● بعض تذکروں میں ان کے مولفین نے زمانی ومکانی قرب سے پوری طرح فائدہ اٹھاکر ہم عصر شاعروں کے بارے میں ضروری معلومات کا وہ بیش قیمت سرمایہ فراہم کردیا ہے جو دیگر ذرائع سے حاصل نہیں ہوسکتا۔

● تذکروں میں بعض دفعہ ایسی کتابوں کے حوالے اور اقتباسات بھی مل جاتے ہیں جو یقینی طور پر معدوم ہوچکی ہیں یا جن کی بازیابی کے امکانات تقریبا مفقود ہیں۔ اس قسم کے حوالے محققین ادب کو ایسی نایاب ومعدوم کتابوں کی تلاش وجستجو کی جانب متوجہ کرتے ہیں۔

● بیش تر تذکروں میں تذکرہ نگار کے علاوہ دوسرے اہل الرائے اور صاحب نظر اساتذہ کے خیالات کا بھی علم ہوتا ہے، مثال کے طور پر قاسم کے تذکرے میں جرأت کے کلام کے متعلق اور "گلشن بے خار" میں میر کی شاعری کی نسبت مفتی صدرالدین خان آزردہ کا قول۔

[اردو تذکرہ نگاری ۱۸۳۵ء کے بعد، ص: ۴۳، ۴۴، عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی]

تذکرۂ جمیل:

اب تک کی گفتگو تذکرہ کے عام معانی ومفاہیم، تذکرہ نگاری کی حقیقت، اس راہ میں در پیش مشکلات اور اس کے فوائد سے متعلق تھی، مگر ہمارے مضمون کی پیشانی پر جو "**تذکرۂ جمیل**" نقش ہے وہ کوئی عام تذکرہ یا شعرا کے احوال وخدمات کا مجموعہ نہیں ہے، بلکہ اس سے مراد حجۃ الاسلام حضرت علامہ شاہ محمد حامد رضا خان قادری بریلوی قدس سرہ (متوفیٰ: ۱۷/ جمادیٰ الاولیٰ ۱۳۶۲ھ/ ۲۳/ مئی ۱۹۴۳ء) کی وہ دل کش ودل چسپ "**سوانح حیات**" ہے جسے حضرت مولانا محمد ابراہیم خوشتر صدیقی (متوفیٰ: ۵/ جمادیٰ الاخریٰ ۱۴۲۳ھ/ ۱۵/ اگست ۲۰۰۲ء) نے بڑی عرق ریزی اور کمال احتیاط سے قلم بند کیا ہے۔

گویا یہاں "تذکرہ" کا معنیٰ "سوانح حیات" ہے؛ اس لیے ہم سر دست سوانح حیات سے متعلق چند بنیادی باتیں اور سوانح نگاری کے بعض اصول وضوابط اختصار کے ساتھ درج کرتے ہیں، پھر ان شاء اللہ تعالیٰ اس کی روشنی میں "تذکرۂ جمیل" کا ایک جائزہ پیش کرتے ہیں۔

سوانح نگاری اور اس کا ارتقا:

سوانح حیات اس تصنیف کو کہتے ہیں جس میں کسی شخص کی زندگی کے واقعات واحوال مفصل طور پر بیان کیے جائیں۔ سوانح کا تعلق تاریخ سے ہے، لیکن اپنی بعض خصوصیات کی وجہ سے اس کا شمار ادب میں کیا جاتا ہے۔ سوانح محض انسان کی پیدائش، خاندان، تعلیم، مشاغل زندگی اور وفات کا بیان نہیں ہے، بلکہ اس میں کسی فرد کے ظاہر وباطن، عادات واطوار، نفسیاتی کیفیات اور زندگی کے نشیب وفراز کی پوری داستان ہوتی ہے۔ اردو وکیپیڈیا میں ہے:

"سوانح حیات کسی بھی انسان کی زندگی کے ایک تفصیلی بیان کو کہا جاتا ہے۔ سوانح حیات میں انسان کی ابتدائی زندگی، تعلیم، کام، رشتوں، معاشرتی زندگی اور موت تک کے تمام پہلو بیان ہوتے ہیں۔ سوانح

حیات میں حالات اور واقعات بھی بیان ہوتے ہیں جن سے دیگر انسان سبق سیکھتے ہیں۔ بہت زیادہ برے یا بہت زیادہ اچھے کام کرنے والے لوگوں کے سوانح حیات تاریخ میں سبق آموز ہونے کی وجہ سے یاد رکھے جاتے ہیں۔ مختصر یہ کہ سوانح حیات ایک انسان کی زندگی کی کہانی ہوتی ہے"۔[https://ur.wikipedia.org]

سوانح نگاری میں ہر زمانہ کے حالات، طرز نگارش اور رسم ورواج کا بڑا اثر رہا ہے۔ مثلاً عہد قدیم میں آشور، بابل اور مصر وغیرہ کے بادشاہوں کے حالات لکھے جاتے تھے، لیکن ان کی تعریف میں اتنی قصدہ گوئی ہوتی کہ افسانہ اور حقیقت میں فرق کرنا مشکل ہوتا تھا۔ رومن عہد میں بھی سوانح نگاروں میں پلوٹارک کا نام آج تک زندہ ہے اور اس کی تصنیف "مشاہیر یونان و روم" دنیائے ادب اور سوانح نگاری میں بہت بڑا مقام رکھتی ہے۔

عہد وسطیٰ کے یورپ کی سوانح عمریوں میں انسانی اچھائیوں اور کمزوریوں کا بیان اور خارجی نقطۂ نظر بہت کم ملتا ہے۔ مذہبی عقیدت اور ولیوں کے مافوق الفطرت کارناموں اور کرامات پر اعتقاد زیادہ نظر آتا ہے۔

اٹھارویں صدی کے درمیان یورپ کے اندر سوانح نگاری میں پختگی آئی اور اب حالات کی چھان بین پر توجہ کی جانے لگی، خطوط اور دوسری تحریروں کا مطالعہ کیا جانے لگا۔ اس دور کی معرکۃ الآرا سوانح عمری سیمول جانسن کی ہے جو باسول نے 1791 میں لکھی تھی۔

انیسویں صدی میں کارلائل اور ارنسٹ رینان کی لکھی سوانح عمریاں اپنا جواب نہیں رکھتیں۔ اس پختگی اور کھوج پر توجہ اور حقیقت نگاری کے باوجود اس زمانہ کی اخلاقی قدریں لوگوں کے کمزور پہلوؤں کی عکاسی سے روکتی تھیں؛ اس لیے یہ کہنا مشکل ہے کہ سوانح نگار اپنے ہیرو کی مکمل سچی تصویر پیش کرنے میں کامیاب تھے۔

بیسویں صدی میں دوسرے فنون کی طرح فن سوانح نگاری بھی عروج پر پہنچا اور اعلیٰ پایہ کی سوانح عمریاں لکھی جانے لگیں۔[سوانح عمری۔ اردو دائرۃ معارف العلوم، ملخصا۔ www.urduencyclopedia.org]

اردو ادب میں سوانح نگاری کی باضابطہ ابتدا سرسید تحریک سے ہوئی، جس کا مقصد لوگوں کو اپنے بزرگوں کے کارناموں اور ان کی پاکیزہ زندگی کے اہم گوشوں سے آگاہ کرنا تھا۔

سوانح/تذکرہ نگاری کے اصول:

اجمالی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ سوانح نگاری یا تذکرہ نویسی کا بنیادی اصول یہ ہے کہ اس کا مطالعہ کرنے والا صاحب تذکرہ سے اچھی طرح باخبر ہوجائے اور اس کی چلتی پھرتی تصویر قاری کی نگاہوں کے سامنے آجائے۔ اس کے لیے درج ذیل امور کی رعایت بہت اہم اور ضروری ہوتی ہے اور ان ہی امور کو سوانح نگاری یا تذکرہ نویسی کے اصول بھی کہہ سکتے ہیں۔

● شخصیت کا انتخاب:

سوانح نگاری یا تذکرہ نویسی میں پہلا مرحلہ شخصیت کا انتخاب ہے؛ اس لیے کہ جب تک کسی شخصیت کا انتخاب نہ ہوجائے، تذکرہ نگاری کا عمل شروع نہیں ہوسکتا۔ یہ انتخاب اس لحاظ سے بڑی اہمیت کا حامل ہوتا ہے کہ اگر اس میں کسی ایسے فرد کا انتخاب ہوگیا جس سے متعلق تذکرہ نگار کی اپنی معلومات کا ذخیرہ مختصر ہو اور دیگر ذرائع سے مواد کم دستیاب ہوں تو اس کی عمدہ سوانح حیات ترتیب دینا بڑا مشکل کام ہوگا، بلکہ یوں کہہ سکتے ہیں

اس کا بہتر اور کام یاب تذکرہ مرتب کرنا تقریباً ناممکن ہوگا، مگر اسی کے ساتھ یہ حقیقت بھی مسلم ہے کہ کسی بڑے مدبر و مفکر یا ہمہ جہت صاحب فضل و کمال کی سوانح حیات لکھنا بھی کچھ کم مشکل نہیں ہے، کیوں کہ اس کی زندگی میں قسم قسم کی مصلحتیں، نوع بنوع کی حکمتیں اور طرح طرح کے سیاسی و سماجی معاملات و مسائل کی اس قدر کثرت ہوتی ہے کہ ان میں ذاتی خوبیوں اور خامیوں کا پتہ لگانا مشکل ہوجاتا ہے۔

اس جہت سے علامہ خوشتر صدیقی کے حسن انتخاب کی داد دینی چاہیے کہ انھوں نے ایسی جامع فضائل و کمالات شخصیت کو منتخب کیا ہے جن کے بارے میں خود ان کے پاس معلومات کا بڑا ذخیرہ تھا اور ان سے متعلق دیگر ذرائع سے بھی معلومات فراہم کرنا آسان تھا؛ اسی لیے کہا گیا ہے ؎

شاہ حامد رضا پیشوائے زمن ذکر اس کا ہے اب بھی چمن در چمن
نام تھا اس کا حامد، وہ محمود تھا ذات تھی اس کی تنہا مگر انجمن

اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ علامہ خوشتر صدیقی نے حضرت حجۃ الاسلام کی ایک عمدہ اور بہتر سوانح حیات مرتب فرمادی جو ایک طرف خانوادۂ رضا کے وابستگان کے لیے نہایت معلومات افزا ہے تو دوسری طرف اردو تذکرہ نگاری کے ادبی باب میں ایک گراں قدر اضافہ بھی ہے۔

● موادکی فراہمی:

کسی بھی سوانح یا تذکرہ کے لیے مواد کی فراہمی سب سے اہم ہوتی ہے، اس کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ تذکرہ نگار صاحب تذکرہ کے جائے قیام کا دَورہ کرے، ان کے متعلقین و متوسلین سے رابطہ رکھے، ان کی تصنیفات و تالیفات کا مطالعہ کرے، موافقین و مخالفین کی باتوں پر خوب غور و فکر کرے۔ یہی وجہ ہے کہ مواد کی فراہمی میں صاحب تذکرہ کے خطوط، ڈائری، یادداشتیں، مخالفین کے اعتراضات، موافقین کے جوابات، ہم عصروں کی شہادتیں، ذاتی واقفیت اور تاثرات بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔

علامہ خوشتر صدیقی نے اپنی حیات مستعار کے بڑے قیمتی لمحات صاحب تذکرہ کے مولد و مسکن بریلی شریف میں گزارے ہیں اور وہاں کے دارالعلوم منظر اسلام اور دارالعلوم مظہر اسلام سے اکتساب علم و فیض کیا ہے، حامدی اساتذہ کے زیر سایہ پروان چڑھے ہیں اور حضرت حجۃ الاسلام کے جمال و کمال، اخلاق و کردار اور شب و روز کی مصرفیات کا مشاہدہ کیا ہے اور ان سے اجازت و خلافت پائی ہے۔

بایں ہمہ علامہ خوشتر صدیقی نے اس تذکرہ کی ترتیب و تالیف میں بڑی جد و جہد کی ہے اور اپنی معلومات و یادداشت کے علاوہ مختلف ذرائع سے سوانحی مواد یکجا کیا ہے۔ اس راہ میں انھوں نے کتنی مشکلات کا خندہ پیشانی سے استقبال کیا ہوگا، اس کا کچھ اندازہ علامہ شمس بریلوی کے اس اقتباس سے لگایا جاسکتا ہے، وہ لکھتے ہیں:

"حضرت حجۃ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کی سادہ مزاجی، شہرت سے گریز کا مشاہدہ میں نے خود کیا ہے۔ دارالعلوم منظر اسلام کے انتظامی امور خاموشی کے ساتھ انجام دینا اور پھر علمی خدمات میں انہماک آپ کا وطیرہ تھا۔ ستائش و مدحت آپ کو پسند نہیں تھی، مریدین سے صرف وقتی روابط تھے۔ آپ نے کبھی اس طرف توجہ نہیں فرمائی کہ اپنے اوقات یومیہ اور مصروفیات شبانہ روز کو ضبط تحریر میں لائیں۔ تصنیف و تالیف کا کام بھی نہایت خاموشی سے انجام دیتے تھے، چنان چہ میں نے آپ کی زبان سے نہیں سنا کہ آپ " الدولة المكية " کا ترجمہ تحریر فرمارہے ہیں۔ ایسی خاموش زندگی کے احوال کو معرض تحریر میں لانا ایک بہت ہی مشکل کام ہے۔ حضرت

خوشتر صدیقی جمال پوری نے اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ حضرت حجۃ الاسلام کی یہ سوانح حیات مرتب کرنے میں کس قدر کاوش کی ہوگی اور سوانحی مواد کہاں کہاں سے حاصل کیا ہوگا"۔

[مقدمۂ تذکرۂ جمیل بعنوان "تذکرۂ جمیل کی توثیق جلیل، ص:۲۳، سنی رضوی اکیڈمی، ماریشس]

تذکرہ نگاری کے باب میں اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اگر معلومات و مواد کی فراہمی کے ذرائع قابل اعتماد ہیں تو تذکرہ میں نقل کی گئی باتیں بھی مستند اور قوی مانی جاتی ہیں، ورنہ کسی منصف مزاج نقاد کی نظر میں ان باتوں کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی ہے۔ اس حقیقت کے پیش نظر علامہ خوشتر صدیقی نے ان تمام ذرائع کا بھی ذکر کر دیا ہے جن سے انھوں نے معلومات و مواد کی تحصیل کی ہے اور اس کے بیان کے لیے انھوں نے ایک عنوان قائم کیا ہے:

تذکرۂ جمیل کی روایاتی سندیں:

اس عنوان کے تحت لکھا ہے کہ "راقم الحروف نے جب سے ہوش کی آنکھیں کھولیں، حضرت حجۃ الاسلام کے جمال و کمال کا آفتاب نصف النہار پر دیکھا اور اپنے زمانہ میں حضرت کا کسی کو شریک و سہیم نہیں پایا، مشائخ میں آپ اپنی مثال نظر آتے، پھر یہ حسن اتفاق کہیے کہ مجھے حامدی اساتذہ بھی میسر آئے۔ میں ان ہی ایام سے ان روایتوں کو جمع کرتا جو حضرت حجۃ الاسلام کی سوانح سے متعلق تھیں۔ اس سلسلے میں مندرجہ ذیل حضرات سے میں نے براہ راست استفادہ کیا ہے:

① حضرت علامہ حسنین رضا خان خلیفہ و برادر زادہ امام احمد رضا، ان کی خدمت میں کئی ماہ حاضر رہا، بہت سے واقعات براہ راست سننے میں آئے، نیز سوال و جواب کی صورت میں آپ کے ارشادات ٹیپ کیسٹ میں محفوظ کر لیے۔

② مولانا محمد احسان علی صدیقی، محدث بریلوی۔ (متوفیٰ:۱۴۰۲ھ/۱۹۸۲ء)

③ مولانا مفتی ابرار حسن صدیقی، مدیر "یادگار رضا"، بریلی۔

④ مولانا تقدس علی خان بریلوی، فرزند نسبتی حضرت حجۃ الاسلام۔ (متوفیٰ:۱۴۰۸ھ)

⑤ مولانا سردار ولی خان، عرف عزو میاں، بریلوی۔

⑥ صاحب زادۂ حجۃ الاسلام مولانا محمد ابراہیم رضا خان، جیلانی میاں۔ (متوفیٰ:۱۳۸۵ھ/۱۹۶۵ء)

⑦ صاحب زادۂ حجۃ الاسلام مولانا محمد حماد رضا خان، نعمانی میاں۔ (متوفیٰ:۱۳۷۵ھ/۱۹۵۶ء)

ان حضرات سے طالب علمی کے ابتدائی ایام میں روایۃً و سمعاً بہت کچھ حاصل کیا۔

⑧ محدث اعظم پاکستان مولانا سردار احمد لائل پوری۔ (متوفیٰ:۱۳۸۲ھ/۱۹۶۲ء)۔

ان کی خدمت میں ۱۹۵۳ء سے ۱۹۵۵ء تک رہنے کا موقع ملا، ان کی مجلس میں حضرت حجۃ الاسلام کا شخصی کمال اور علمی جاہ و جلال کا گوشۂ مستور آفتاب نصف النہار کی طرح روشن ہوا اور آپ کی صورت و سیرت کے حسین خدوخال نمایاں سے نمایاں تر ہوتے گئے۔

مجھے اس سلسلہ میں مارہرہ مقدسہ اور بریلی شریف شدّ رحال کرنا پڑا اور ایک بار پھر میں نے آقاؤں کے دروازے پر دستک دی اور اپنے محب گرامی حضرت مولانا تحسین رضا خان بریلوی کو اس کار حامد رضا میں شریک بالرضا پایا۔

" تذکرۂ جمیل " کے یہ چند اوراق ان ہی نفوس قدسیہ کے عطایا ہیں۔ہاں! ان میں زبان و قلم کی کوئی لغزش یا بیان و روایت میں کوئی جھول نظر آئے تو اس کا ہر طرح ذمہ دار راقم الحروف مرتب ہوگا۔
[تذکرۂ جمیل، ص:۸۰، ۸۱، ملخصا، سنی رضوی اکیڈمی، ماریشس]

● **شخصیت کا ذاتی تعارف:**

اس کے تحت صاحب تذکرہ کا نام و لقب، کنیت و نسبت، مولد و مسکن، جسمانی خد و خال، علمی و فنی استعداد، شاگردی و استاذی کے سلسلے، تصنیفی و تالیفی خدمات اور اصلاحی و تعمیری کارناموں وغیرہ کا ذکر اختصار کے ساتھ ہوتا ہے۔

اس زاویے سے جب ہم " تذکرۂ جمیل " کا مطالعہ کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ علامہ خوشتر صدیقی نے بڑی خوش اسلوبی سے شخصیت کا ذاتی تعارف کرایا ہے۔ چنان چہ **" نمود صبح "** کے عنوان سے لکھتے ہیں:

"حضرت حجۃ الاسلام مولانا محمد حامد رضا خان اسلامی مہینہ کی فصل بہار ربیع الاول ۱۲۹۲ھ/۱۸۷۵ء میں اپنے دادا خاتم المحققین مولانا نقی علی خان (متوفی:۱۲۹۷ھ/۱۸۸۰ء) کے گھر بریلی، یوپی میں پیدا ہوئے۔

امام احمد رضا نے اپنے بڑے صاحب زادے کا نام حدیثی ارشاد کے مطابق " محمد " رکھا، پکارنے کے لیے " حامد رضا " تجویز فرمایا، خان سے حسب و نسب کی نشان دہی کی، عوام نے " بڑے مولانا " کہ کر خراج عقیدت پیش کیا، اور خواص نے " حجۃ الاسلام " کا لقب دے کر آپ کے علم و فضل کا اقرار کیا"۔
[تذکرۂ جمیل، ص:۱۰۶، سنی رضوی اکیڈمی، ماریشس]

عہد طفلی اور تعلیم و تربیت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

" مارہرہ مقدسہ اور بریلی شریف میں طریقت و شریعت کا آفتاب نصف النہار پر تھا، اس کی روشنی میں سارا برصغیر جگمگا رہا تھا، اسی روشن ماحول میں حجۃ الاسلام کا عہدِ طفلی شروع ہوا۔ آپ کو اپنے عظیم دادا کا فیضان، پیر و مرشد ابو الحسین احمد نوری (متوفی: ۱۳۲۴ھ/۱۹۰۶ء) کا ایقان اور نامور باپ کا شہرۂ آفاق ایمان میسر آیا، ہوش کی آنکھیں کھلیں تو ہر طرف کتاب و سنت کی حکمرانی نظر آئی، فقہ حنفی کا سکہ چلتا ہوا دیکھا، دین متین کی حمایت اور اس کے رسول کے دشمنوں کی عداوت میں اپنے اَب وجد کو یکتائے روزگار پایا۔

یہ حقیقت بھی اس خاندان میں باپ دادا سے طرۂ امتیاز رہی ہے کہ مولانا محمد رضا علی (متوفی:۱۲۸۲ھ/۱۸۶۶ء) نے اپنے بیٹے محمد نقی علی خان کو خود پڑھایا اور بالکل اسی طرح انھوں نے اپنے فرزند ارجمند احمد رضا کو نہ صرف خود پڑھایا، بلکہ ایسی تربیت دی کہ شاید باید۔۔۔

آبا و اجداد کی شان دار روایات کے مطابق حضرت حجۃ الاسلام نے تمام کتابیں اپنے نابغۂ روزگار والد امام احمد رضا سے پڑھیں اور اپنے معاصرین میں یہ امتیاز پایا کہ صرف ۱۹ر سال کی عمر میں ۱۳۱۱ھ/۱۸۹۴ء میں فارغ التحصیل ہوگئے۔ [تذکرۂ جمیل، ص:۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۰، ملخصا، سنی رضوی اکیڈمی، ماریشس]

سراپاے کمال کے عنوان سے جسمانی خد و خال وغیرہ کا تذکرہ اس انداز سے کیا ہے:

"**بلند و بالا قد** ـــــ بالاے سرش زہوش مندی ✱ می تافت ستارۂ بلندی ـــــ **کشادہ پیشانی** ـــــ سیماھم فی وجوھھم من أثر السجود کا مصداق۔ ـــــ **رنگت** ـــــ سرخ و سفید، ملاحت

آفریں، جاذب نظر اور دل نشیں۔ ـــــ **چہرہ** ـــــ ایسا حسین اور نورانی کہ بڑے سے بڑے مجمع میں نمایاں، دور ہی سے معلوم ہوجائے کہ " وہ تشریف فرماہیں بڑے مولانا"۔ـــــ **خدوخال** ـــــ ایسے وجیہ اور صبیح کہ ہزاروں میں ممتاز۔ـــــ **حسن وجمال** ـــــ ایسا کہ جس محفل میں ہوتے جان محفل ہوتے اور ؎

" زفرق تابقدم ہرکجا کہ می نگرم ✸ کرشمہ دامن دل می کشد کہ جاایں جااست " کا عالم ہوتا، متانت وسنجیدگی کا پیکر، لطف وکرم کا مجسمہ، اخلاق حسنہ کا نمونہ، صبر وشکر اور رضاے الٰہی کا مرقع، اجداد کرام کی طرح عشق رسول ﷺ میں مستغرق، کڑی سے کڑی آزمائش میں شکر الٰہی برلب، ہزل وتمسخر سے دور، نہایت دلیر، جری اور غیور۔ع لاؤں کہاں سے ایسا کہ تجھ سا کہیں جسے "۔

[تذکرۂ جمیل، ص:۸۵، سنی رضوی اکیڈمی، ماریشس]

تصنیفات وتالیفات وغیرہ کے ذکر کے لیے ایک انوکھا عنوان " **جلوہ آرائیاں** " قائم کرکے اس کے تحت حجۃ الاسلام کی تمام تصنیفات، تصدیقات، جوابات، سندات، وظائف وعملیات، منظومات، رسالہ جات اور نوادرات کا اجمالی ذکر کیا ہے، پھر ہر ایک کے مناسب صفحہ کی فوٹو کاپی پیش کرکے گویا مذکورہ تمام چیزوں کی تفصیل مع سند پیش کردی ہے۔[ان کی تفصیل تذکرۂ جمیل کے ص:۲۶ تا ص:۷۵ پر موجود ہے]

● خاندانی پس منظر:

کسی تذکرہ میں جب تک خاندانی پس منظر تحریر نہ ہو، وہ نامکمل معلوم ہوتا ہے؛ اس لیے علامہ خوشتر صدیقی نے چند صفحات میں بڑی جامعیت کے ساتھ حجۃ الاسلام کے خاندان کا بھی ذکر کیا ہے جو تاریخی اور معلومات افزا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ محمد شاہی دَور [۱۱۵۲ھ/۱۷۳۹ء] میں قندھار کا ایک قافلہ لاہور میں وارد ہوا، اس میں صاحب تذکرہ کے مورث اعلیٰ نادرۂ روزگار وفرد باوقار **محمد سعید اللہ خان** بھی تھے۔ شاہ دہلی نے انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا، لاہور کا شیش محل ان کی جاگیر قرار دیا، معزز عہدے ان کے قدم چومتے رہے، دہلی آئے تو منصب شش ہزاری پر انھیں فائز کیا گیا۔ سلطان محمد شاہ نے " شجاعت جنگ " کا خطاب دے کر ان کی عسکری صلاحیتوں کا برملا اعتراف کیا اور ریاست رامپور میں بہت سے مواضعات جاگیر میں عطا فرمائے۔

ان کے نامور فرزند **سعادت یار خان** محمد شاہ دہلی کی وزارت میں وزیر مال مقرر ہوئے، اس طرح بادشاہ نے اس خاندان کی عسکری صلاحیتوں کے ساتھ مالی تدبر کا بھی اقرار کرلیا اور ازراہ قدردانی سعادت یار خان کو ضلع بدایوں کے کچھ گاؤں جاگیر میں عطا فرمائے۔

اٹھارہویں صدی کے ہندوستان میں اگر مسلمانوں کا کوئی طبقہ عیش وعشرت کی زندگی سے محفوظ تھا تو وہ صرف بریلی کے افغان قبائل روہیلے تھے اور ان کا صدر مقام روہیل کھنڈ بریلی تھا، چنانچہ قدرت کو یہی منظور تھا اور مشیت ایزدی کا فیصلہ خوب تھا کہ بریلی نہ صرف روہیل کھنڈ اور روہیلہ قوم کا مرکز قرار پائے، بلکہ رہتی دنیا تک علم وفضل اور حق وہدایت کا آستانہ بھی رہے۔

سلطنت دہلی نے جب بریلی روہیل کھنڈ کی مہم سر کرنے کا ارادہ کیا تو اس عظیم الشان کام کے لیے قرعۂ فال جناب سعادت یار خان کے نام نکلا۔ اس معرکہ میں ان کی جبلی شجاعت اور جنگی مہارت کے جوہر خوب خوب چمکے، فتح بریلی کا سہرا ان ہی کے سر رہا اور فرمان شاہی آیا کہ بریلی کو صوبہ بنادیا جائے اور سعادت یار خان کو

بریلی کا صوبہ دار۔ مگر موت نے مہلت نہ دی۔ ہاں! ان کے نامور صاحبزادگان اعظم خان، معظم خان، مکرم خان نے نہ صرف یہ کہ اپنی موروثی عزت وعظمت اور منصب وشرافت کو بحال رکھا، بلکہ **اعظم خان** نے تو منصب وزارت سے سبک دوش ہوکر زہد وریاضت کی وادی میں اپنا قدم رکھا اور ملک چھوڑ کر مالک الملک کو اپنانے کی ادھمی اور سمنائی مثال ایک بار پھر پیش کردی اور حکومت کی کرسی سے الگ ہوکر محلہ معماران بریلی کے گوشۂ قبرستان کو اپنا مسکن بنالیا۔

اس طرح **سعادت یار خان** کا نامور پوتا اور واصل باللہ **جناب اعظم خان** کا قابل قدر بیٹا **حافظ کاظم علی خان** اپنے خاندانی جاہ وحشم کا وارث قرار پایا، شہر بدایوں کا نظم ونسق اس کے ہاتھوں میں تھا، دوسو سواروں کی بٹالین اس کی باڈی گارڈ تھی، آٹھ گاؤں جن پر کوئی ٹیکس نہ تھا، ان کی جاگیر تھے۔

حافظ کاظم علی خان کے بیٹے **رضا علی خان** ۱۳۲۴ھ/۱۸۰۹ء میں بریلی میں پیدا ہوئے، آپ اس خاندان کے پہلے شخص ہیں جو علم دین کی دولت لائے، سب سے پہلے مسند افتا کو زینت بخشی اور ان ہی کی ذات سے اس خاندان میں تلوار کے بجائے قلم کا دَور شروع ہوا، آپ اپنے جدامجد اور والد ماجد کے خلف الصدق قرار پائے، اسلاف کا جاہ وحشم، علم وفضل، زہد وتقویٰ آپ کی ذات میں نمایاں اور پیشانی سے تاباں تھا۔

مولانا رضا علی خان کے بیٹے **نقی علی خان** ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۰ء میں محلہ ذخیرہ، بریلی میں پیدا ہوئے اور اپنے والد ماجد سے تمام علوم وفنون حاصل کیے اور بہت جلد فضل وکمال کے بلند وبالا منصب پر پہنچ کر اطراف واکناف میں مشہور ومعروف ہوگئے۔ درس وتدریس، تصنیف وتالیف کے علاوہ علم وعمل، فکر ونظر، فہم وفراست میں بے نظیر تھے، مزید برآں سخاوت وشجاعت، غربا سے محبت، حکام سے نفور، خلوت وجلوت میں اتباع سنت، امور دینی میں استقامت آپ کی زندگی کا بڑا روشن پہلو ہے۔ پھر عشق رسول اور سرکوبی اعدائے دین رسول مقبول ﷺ تو آپ کا سرمایۂ زندگی تھا۔ ان فضائل ومحاسن کے علاوہ یہ آپ کی ذات کا طغرائے امتیاز ہے کہ آپ نے اپنے ولد اسعد **احمد رضا خان** کی ایسی تعلیم وتربیت فرمائی کہ چودھویں صدی کو ایک بے مثال عالم سنت اور مجدد دین وملت میسر آیا۔ [تذکرۂ جمیل، ص:۸۹ تا ۹۹، ملخصا، سنی رضوی اکیڈمی، ماریشس]

- **واقعات کا انتخاب:**

انسان کی زندگی مختلف قسم کے واقعات اور طرح طرح کے مسائل سے معمور ہوتی ہے، ہر واقعہ اپنے اندر ایک کشش اور ہر مسئلہ اپنے دامن میں کوئی پیغام رکھتا ہے، لیکن تذکرہ نگار کے لیے ہر واقعہ اہم نہیں ہوتا، بلکہ اسے تو ان واقعات کا انتخاب کرنا ہوتا ہے جو کسی حد تک انقلاب آفریں ہوں اور اس سے فرد کے کردار پر روشنی پڑتی ہو۔

اس لحاظ سے جب آپ "تذکرۂ جمیل" کی ورق گردانی کریں گے تو جابجا نصیحت آمیز اور عبرت انگیز واقعات نظر آئیں گے۔ بطور مثال بعض واقعات درج ذیل ہیں:

- حجۃ الاسلام کے اجداد میں ایک نام ہے اعظم خان۔ انھوں نے وزارت سے کنارہ کش ہوکر گوشہ نشینی اختیار کرلی تھی۔ ان کے بیٹے حافظ کاظم علی خان بدایوں کے سٹی مجسٹریٹ تھے، وہ بے پناہ مصروفیات کے باوجود ہر جمعرات کو اپنے والد کی زیارت کے لیے حاضر ہوتے تھے۔ انھوں نے ایک بار موسم سرما میں دیکھا کہ

والد بزرگ خلوت خانۂ گورستان میں ایک الاؤ لگائے یاد حق میں مشغول ہیں اور جسم پر موسم سرما سے بچاؤ کے لیے کوئی کپڑا نہیں ہے۔ صاحبزادہ کو احساس ہوا اور اپنا قیمتی دوشالہ حضرت کو اوڑھا دیا۔

اللہ اللہ! جو نفس قدسی لباس تقویٰ سے مزین ہو، جس نے مخلوق سے منہ موڑ کر اپنا رشتہ خالق سے جوڑ لیا ہو، اس پر کسی قیمتی دوشالہ کا کیا اثر اور اسے گرمی و سردی کی کیا خبر۔ انھوں نے بڑی بے نیازی سے شال کو اتار کر بھڑکتی ہوئی آگ میں ڈال دیا۔

حافظ کاظم علی خان اپنے والد گرامی قدر کی شان کا نظارہ اپنی آنکھوں سے کر رہے تھے، انھیں خیال آیا اور یہ خیال فطری تھا کہ یہ دوشالہ کسی اور کو دے دیا جاتا تو کام آجاتا۔ حافظ صاحب کا یہ خیال ابھی پردۂ دماغ میں تھا کہ مرد خدا دوست حضرت اعظم خان کی زبان حق ترجمان نے یہ کہہ کر "کاظم! فقیر کے یہاں دھکڑ پکڑ کا معاملہ نہیں ہے" ظاہر کر دیا اور بھڑکتی ہوئی آگ سے دوشالہ نکال کر اپنے صاحبزادے کو واپس کر دیا۔ دیکھا گیا تو دوشالہ آگ سے محفوظ، صاف و بے داغ برآمد ہوا"۔

آج بھی ہو جو براہیم سا ایماں پیدا ✷ آگ کر سکتی ہے انداز گلستاں پیدا

[تذکرۂ جمیل، ص:۹۴، ملخصا، سنی رضوی اکیڈمی، ماریشس]

● حجۃ الاسلام کے والد ماجد اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان قدس سرہ کی زندگی کے نصیحت آمیز واقعات تو بہت ہیں، مگر علامہ خوشتر صدیقی نے ان کی آخری مجلس رشد و ہدایت کے جو کلمات نقل کیے ہیں ان سے ایک کامیاب انسان کے مقصد زندگی پر بھرپور روشنی پڑتی ہے۔ وہ کلمات یہ ہیں:

" اے لوگو! تم پیارے مصطفیٰ ﷺ کی بھولی بھیڑیں ہو اور بھیڑیے تمھارے چاروں طرف ہیں، وہ چاہتے ہیں کہ تمھیں بہکائیں، تمھیں فتنہ میں ڈال دیں، تمھیں اپنے ساتھ جہنم میں لے جائیں۔ ان سے بچو اور دور بھاگو۔ دیوبندی، رافضی، نیچری، قادیانی، چکڑالوی، یہ سب فرقے بھیڑیے ہیں، تمھارے ایمان کی تاک میں ہیں، ان کے حملوں سے ایمان کو بچاؤ"۔ [تذکرۂ جمیل، ص:۱۰۴، سنی رضوی اکیڈمی، ماریشس]

● حجۃ الاسلام کی زندگی بڑی مصروف تھی، آپ کی سفری مصروفیات واضح کرنے کے لیے ایک خط کا اقتباس نقل کیا ہے جو اس باب میں بہت جامع ہے، لکھتے ہیں:

" آپ کی سفری مصروفیات کا اندازہ ۱۳۵۲ھ/۱۹۳۴ء کے اس مکتوب سے بھی ہوگا جس میں لاہور کے جلسہ میں شرکت کا بھی ذکر ہے۔ آپ نے تحریر فرمایا:

"نیز لاہور میں انجمن حزب الاحناف کے جلسے مقرر ہیں جہاں میری صدارت کی اشاعت کر دی گئی اور میں وعدۂ شرکت کر چکا ہوں، پھر فیروز پور کے احباب نے اصرار کیا ہے کہ لاہور سے وہاں آجاؤں اور ایک شادی چند ماہ سے صرف میرے آنے پر ملتوی رکھی ہے، جب میں وہاں پہنچوں گا تو تقرر تاریخ ہوگا اور تقرر تاریخ میرے ہی ذمہ رکھا ہے۔ راہ میں امرتسر کے بعض احباب مصر ہیں کہ یہاں بھی قیام ہو۔ غرض "یک سر، ہزار سودا"۔ [تذکرۂ جمیل، ص:۱۹۳، سنی رضوی اکیڈمی، ماریشس]

● جامعیت کا لحاظ:

کسی بھی تذکرہ میں جامعیت کا لحاظ بہت ضروری ہوتا ہے، اس سے تذکرہ و سوانح کی عظمت میں اضافہ ہوتا ہے اور خود تذکرہ نگار کی رفعتوں میں چار چند لگ جاتے ہیں۔

" تذکرۂ جمیل " اس اعتبار سے بھی بہت مناسب ہے کہ اس میں علامہ خوشتر صدیقی نے اس قدر واقعات و جزئیات سمو دیے ہیں کہ عقیدت مند قاری کو کہیں سے بھی تشنگی کا احساس نہیں ہوتا ہے۔

اس کتاب میں حضرت حجۃ الاسلام کی جیتی جاگتی اور چلتی پھرتی تصویریں اس کی نگاہوں کے سامنے نظر آتی ہیں۔ ان کا بچپن ہو، یا دَور طالب علمی، جوانی ہو یا بڑھاپا، ہر ایک کی منظر کشی کی گئی ہے، یوں ہی فتویٰ نویسی کا کمال ہو یا مناظرانہ جاہ و جلال، تدریس و تحریر کی خوبیاں ہوں یا شب و روز کے معمولات، ہر ایک کا بیان کسی حد تک کر دیا گیا ہے۔

مگر ان تمام خوبیوں کے باوجود حجۃ الاسلام کی حیات مبارکہ کے بہت سے گوشے ایسے ہیں جن کا بیان اس "تذکرۂ جمیل" میں نہیں ہو سکا ہے، یا ہوا بھی ہے تو وہ ناقص و ناتمام ہے۔

اس کمی کا احساس خود تذکرہ نگار علامہ خوشتر صدیقی کو بھی تھا، چنانچہ وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

" اب میں اخیر میں خواجہ تاشان حامدی رضوی کی توجہ مبذول کرانا چاہوں گا کہ " تذکرۂ جمیل " حضرت حجۃ الاسلام مولانا شاہ محمد حامد رضا خان کی سوانح کا آغاز ہے اور احباب واصدقا کے لیے اس عنوان پر صلاے عام ہے۔ ابھی حضرت کی سیرت کے بہت سے نقوش مدھم اور علم و فضل کی داستان نامکمل ہے۔ بہر حال راقم الحروف مرتب ان اوراق میں جتنا پیش کر سکا، وہ اس کا حصہ تھا اور مزید جو پیش کرے گا، وہ اس کا حصہ ہو گا ؎

بے مثالی کی ہے مثال وہ حسن ✸ خوبیٔ یار کا جواب کہاں"۔

[تذکرۂ جمیل، ص:۸۱، ۸۲، سنی رضوی اکیڈمی، ماریشس]

صداقت اور حقیقت نگاری:

تذکرہ نگار کا ہر قسم کے تعصبات سے بالاتر اور مخلص ہونا بہت ضروری ہے۔ کسی کی عقیدت و محبت یا کسی سے بغض و حسد کی بنیاد پر کوئی خلاف واقعہ بات تحریر کرنا ، یا اس کی حیات کے صرف ایک رخ کو پیش کرنا غلط اور تذکرہ نگاری کے میدان میں بہت بڑی خیانت و ناانصافی ہے۔ نقاد، سوانح و تذکرہ میں صداقت و حقیقت نگاری پر بہت زور دیتا ہے۔ اردو میں تذکرہ نگاری کا فن اسی لیے مجروح ہوا کہ اس میں حقیقت کے بجاے عقیدت اور ذاتی تاثرات کا غلبہ رہا۔

تذکرۂ جمیل کا مطالعہ کرنے سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ علامہ خوشتر صدیقی بھی اردو تذکرہ نگاری کی عام روش سے کنارہ کش نہیں ہو سکے اور ان کی تحقیق و جستجو اور مواد کی ترتیب و تزئین میں بھی عقیدت و محبت کا غلبہ رہا ہے، یہی وجہ ہے کہ پوری کتاب میں مجھے کوئی بات ایسی نظر نہیں آئی جس کے بارے میں یہ کہا گیا ہو کہ اگر یہ چیز نہ ہوتی تو اچھا ہوتا، یا یہ بات اس طرح کہی جاتی تو اس کا حسن اور بڑھ جاتا، وغیرہ ذالک۔

علامہ شمس بریلوی اس سلسلے میں بڑی احتیاط کے ساتھ یوں رقم طراز ہیں: " فاضل مؤلف نے سوانح حیات کے لوازم کو تمام و کمال پورا کیا ہے اور صاحب ترجمہ کے تمام مراحل زندگی کو معرض بیان میں لائے ہیں۔ البتہ دو باتوں کی کمی میں نے محسوس کی ہے۔ ایک تو حضرت حجۃ الاسلام رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی شاعری پر نقد و تبصرہ سے آپ نے گریز کیا اور دوسرے آپ کی تصانیف و تواليف پر ناقدانہ نظر نہیں ڈالی ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ شاید یہ دونوں باتیں ایک عقیدت کیش مرید باصفا اور شاگرد رشید کے حدود ادب سے تجاوز کرنے والی تھیں؛ اس لیے آپ نے اس راہ میں قدم نہیں اٹھایا"۔ [تذکرۂ جمیل، ص:۲۴، سنی رضوی اکیڈمی، ماریشس]

ہمارے خیال میں کسی تذکرہ نگار یا سوانح نویس کا صرف فضائل و مناقب بیان کرنا اور اس کے مقابل امور سے یکسر پہلوتہی کرنا، یا کسی شخص کی صرف خوبیاں بیان کرنا اور کوتاہیوں کی طرف سے اپنے قاری کو غافل رکھنا، اس شخص کے واقعی محاسن و کمالات کو بھی مشکوک بنادیتا ہے؛ اس لیے سوانح حیات میں بہر حال ہر طرح کی باتیں نقل کی جانی چاہیے تاکہ اس شخص کی پوری زندگی اور اس کے تمام گوشے قاری کی نگاہوں کے سامنے آجائیں اور تذکرہ نگار غلط بیانی یا طرف داری کے الزام سے محفوظ و مامون بھی رہے۔

• دل کش اسلوب بیان :

یہ حقیقت مسلم ہے کہ اگر آدمی کے اندر اپنی بات سلیقے سے پیش کرنے کا ہنر ہے تو اس کی تلخ باتیں بھی غور سے سنی اور توجہ سے پڑھی جاتی ہیں، بصورت دیگر بڑی کام کی باتیں بھی کوئی دھیان سے سننے یا خوشی سے پڑھنے کا روادار نہیں ہوتا ہے۔ سچ کہا گیا ہے ؎

داند آن کس کہ فصاحت بکلامے دارد ✷ ہر سخن موقع و ہر نکتہ مقامے دارد

یہی حال تذکرہ و سوانح کا بھی ہے، اگر اس کا اسلوب بیان دل کش اور طرز نگارش عمدہ ہے تو لوگ اسے شوق سے پڑھنا چاہتے ہیں، ورنہ تو شروع کرنے کے بعد بھی ایک طرف رکھ دیتے ہیں۔

تذکرۂ جمیل میں بھی اسلوب نگارش کی دل کشی پر کافی توجہ دی گئی ہے اور مضامین کی سرخیاں بھی ایسی قائم کی گئی ہیں کہ انھیں دیکھ کر اصل مضمون پڑھنے کی طرف دل خود بخود مائل ہو جائے، مثلاً

آئینہ بندیاں • صدائے بازگشت • نمود صبح • سرعت تحریر • الولد سر لابیہ • یک سر، ہزار سودا • لاہور کا فیصلہ کن مناظرہ • وغیرہ سرخیاں اسی قسم کی ہیں۔

علامہ خوشتر صدیقی نے تو بعض مقامات پر دوسروں کے اقتباسات کو اس طرح اپنے کلام میں پیوست کر دیا ہے کہ اگر وہ حوالہ نہ دیتے تو قاری اطمینان سے پڑھتا ہوا چلا جاتا اور اسے احساس بھی نہیں ہوتا کہ وہ دوسرے کی عبارت ہے۔ اس طرح سے انھوں نے اپنی بات بھی کہہ دی اور حوالہ بھی ہو گیا۔ چنان چہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

"یہ واقعہ ہے کہ آپ کا سفر ہندوستان کے ہر علاقے میں ہوتا اور جہاں ہوتا وسیلۂ ظفر ہوتا اور ہر جگہ ارادت و زیارت کا منظر دیدنی ہوتا۔ **اے تماشا گاہ عالم روے تو**

ہندوستان کے اکابر علما کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ نگاہوں نے حجۃ الاسلام سے زیادہ حسین چہرہ نہیں دیکھا، پھر اس پر لباس کی سج دھج مزید بر آں تھی، جو لباس بھی آپ زیب تن فرماتے وہ بھی آپ کے جمال سے جگمگا اٹھتا، جس مقام سے گزر ہوتا تو لوگ حسن صوری دیکھ کر انگشت بدنداں رہ جاتے اور سارا ماحول غزل خواں ہوتا۔ ع دم میں جب تک دم ہے دیکھا کیجیے

ان کی شگفتہ باتوں کا یہ عالم ہوتا کہ منہ سے پھول جھڑتے تھے، اہل مجلس کا یہ حال ہوتا کہ " وہ کہیں اور سنا کرے کوئی " حسن خداداد ایسا کہ جس محفل میں ہوتے وہی جان محفل ہوتے، نگاہیں کھلی کی کھلی رہ جاتیں، دیدۂ ہوش پر نیم بے ہوش ہونے کا گمان ہوتا، لوگ وفور دید میں ہکا بکا رہ جاتے اور آنے والا شخص بے خودی میں پکار اٹھتا " ما هذا بشرا إن هٰذا إلا ملك كريم " ان کا حسن و جمال، عمامہ کی بندش، داڑھی کی

وضع قطع اور پاکیزہ صاف ستھرا لباس اور بزرگی دلوں کو مسخر کر رہی تھی۔ وہابیہ وشیعہ حضرات نے کہا کہ ایسی نورانی صورت آج تک دیکھی نہ گئی اور نہ ایسی مدلل تقریر سنی۔

(مولانا قاری محمد مصلح الدین صدیقی، معارف رضا، ص:۲۰۱)

اس طرح دیگر قلم کاروں کی عبارتیں بھی ضم کرتے اور حوالہ دیتے آگے بڑھ گئے ہیں۔ تفصیل دیکھنا چاہیں تو تذکرۂ جمیل کا ص:۱۹۷ کا مطالعہ کریں۔

- **طوالت سے اجتناب:**

عمدہ تذکرہ نگاری یا سوانح نویسی کے لیے ضروری ہے کہ کسی بھی بیان کو طول نہ دیا جائے، بلکہ موقع کے مناسب اختصار پیش نظر رہے، کیوں کہ جب کوئی موضوع بہت طویل ہوتا ہے تو قاری کو اس کے پڑھنے میں اکتاہٹ ہونے لگتی ہے، بلکہ بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ صفحات کی کثرت دیکھ کر ہی اس کے مطالعہ سے آدمی بے زار ہو جاتا ہے۔

"تذکرۂ جمیل" میں بھی اس کا کافی لحاظ رکھا گیا ہے اور بے جا تکرار سے بچنے کی پوری کوشش کی گئی ہے، مگر اس کے باوجود میری نظر میں بعض امور کا تذکرہ بہت طویل ہو گیا ہے، اگر چہ وہ بھی فائدہ سے خالی نہیں ہے، لیکن موقع کے مناسب نہیں معلوم ہوتا، مثلاً حجۃ الاسلام کی سرعت تحریر اور عمدہ تمہید نویسی و ترجمہ نگاری واضح کرنے کے لیے ص:۱۲۶ سے ص:۱۶۹ تک تقریباً ۴۴/ صفحات رقم کیے گئے ہیں اور ان صفحات کے مطالعہ کے درمیان کہیں کہیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم حجۃ الاسلام مولانا شاہ محمد حامد رضا خان بریلوی کے بجائے ان کے والد ماجد اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان قدس سرہ کی سوانح پڑھ رہے ہیں۔

مختصر یہ کہ "تذکرۂ جمیل" ایک متوازن سوانح حیات ہے جس میں تذکرہ نگاری کے اصول وضوابط کی رعایت، واقعات وحقائق کی صداقت اور اختصار وجامعیت کے ساتھ حضرت حجۃ الاسلام سے تذکرہ نگار کی عقیدت ومحبت بھی نمایاں ہے۔

ساجد علی مصباحی، جامعہ اشرفیہ، مبارک پور، اعظم گڑھ، یوپی

۲۵/ جمادی الاخریٰ ۱۴۳۹ھ/ ۱۴/ مارچ ۲۰۱۸ء۔ چہار شنبہ